Date of Publication : 02-08-2

PRICE Rs. 3/-

POSTED AT N.D.P.S.O, New Delhi-01
ON 03-04 August 2015, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2015-17
Licensed to Post Without PrepaymentU (C) 160/2015-17

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

# ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 August 2015
Issue: 30, Vol.: 74

۸تا۱۴راگست ۲۰۱۵ء
شمارہ نمبر: ۳۰، جلد نمبر: ۷۴

# بشر نواز کی یاد میں

○ شمیم حنفی

یہ دلّی کی اُمس بھری گرمی کا مہینہ ہے، ایک غیر دل چسپ اور بیزار کرنے والا مہینہ جولائی۔ بشر نواز اگر اگست کے وسط تک جی لیے ہوتے (پ: 18 اگست 1935) تو اسّی (80) برس کے ہو جاتے۔ کچھ روز پہلے ان کی موت کی خبر نے اُمس اور اُداسی کے احساس میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ابھی حال میں عبداللہ حسین کی موت سے پیدا ہونے والے خلا میں، بشر کے چلے جانے سے سناٹا اور بڑھ گیا۔

ان کا بشارت نواز خاں سے بشر نواز بننے کا فیصلہ بہت سوچا سمجھا اور درست فیصلہ تھا۔ ہر چند کہ بہ قول استاد جوش ملسیانی:

جسے کہتے ہیں بشر اُس میں ہے شر دو تہائی!

بشر نواز میں انسان دوستی اور رواداری، اپنے آپ سے بے نیازی اور ایک طرح کے خلقی اضطراب کا عنصر بہت نمایاں تھا، جیسے مسطح زمین سے کوئی چشمہ خود بہ خود ابل پڑے اور ایک خاموش کنکاری کے ساتھ کسی انجانی منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔ ان کی ایک پرانی غزل کا شعر ہے:

ہمیں دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں

جینے کا جو ڈھب بشر نے اختیار کیا تھا، اب زیادہ عام نہیں ہے، پہلے بھی عام نہیں تھا۔ پھر بھی جس ماحول میں بشر نے سانس لی، اس کی ایک اپنی روایت تھی اور اپنی وضع داریاں۔ یوں بھی اورنگ آباد ہندستان کے ان گنے چنے شہروں میں ہے جہاں گزرے ہوئے وقت، ایک گنگا جمنی روایت اور شریفانہ زندگی کے آثار جا بجا پائے جاتے ہیں۔ برصغیر کی زیادہ تر بستیوں میں بے ہودگی کے ساتھ اچھلتی کودتی فرقہ پرستی اور تنگ نظری نے جو طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا ہے، بشر کا ماحول اس سے بڑی حد تک محفوظ رہا۔ یہ ضرور ہے کہ اجتماعی تاریخ کی بوالعجبیوں کے ساتھ اس کا دائرہ سمٹتا گیا اور اب صورت حال پہلی جیسی نہیں رہی لیکن اورنگ آباد کی خاک سے ہی "تحیر عشق" کی خبر دینے والا، نرالا اور نیم دیوانہ صوفی شاعر سراج اٹھا تھا۔ اور معظم، شفیق فاطمہ شعریٰ، قاضی سلیم، فضیل جعفری، وحید اختر جیسے ادیب اور شاعر بھی جن کی حسیت کی تعمیر و تہذیب میں بہت نمایاں رہے، کبھی ایک ساتھ اسی ماحول کا حصہ تھے۔

بشر نے اس خوب صورت، سنہری زرخیز مٹی والے روایتی شہر میں اپنی مرضی کی زندگی گزاری اور غدار شہروں، مہانگروں کے عذاب سے یکسر محفوظ رہے۔ شاید اسی لیے، بشر کی طبیعت میں خوشی اور خوش دلی کے ساتھ زندہ رہنے کی عادت اور طلب بہت گہری تھی۔ انھوں نے بہت یادگار اور شوخ تحریریں بھی لکھی ہیں۔

بشر نے رسمی تعلیم کس حد تک حاصل کی تھی، اس کا مجھے علم نہیں، لیکن ان کی ذہانت اور تجسس بھرے علمی مذاق نے انھیں اپنے گرد و پیش کی دنیا کے فکری مزاج سے ہمیشہ باخبر رکھا۔ انھوں نے نظم اور غزل کے علاوہ نثر بھی بہت لکھی ہے اور ان کا شوق مطالعہ بے پایاں تھا۔ یادداشت اچھی تھی، اس لیے اپنے زمانے کے ادب کے ساتھ ساتھ کلاسیکی ادب اور شعر (بہ شمول فارسی) کے رموز پر بھی وہ بہت اچھی گرفت رکھتے تھے۔

ان کے انتقال کی خبر کے ساتھ مجھے اورنگ آباد کا اپنا پچھلا سفر بھی حافظے میں محفوظ رہ جانے والی کئی جگمگ کرتی شبیہوں اور تصویروں اور رنگوں اور رونقوں کے ساتھ بار بار یاد آیا۔ ہم سرا بھی ساہتیہ اکادمی کی دعوت پر وہاں گئے تھے۔ اپنے تین چار روزہ قیام کے دوران ہم نے ایلورا کے لازوال، پرجلال اور مبہوت کر دینے والے غاروں کو ایک بار پھر سے دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ کئی دوستوں کے ساتھ، بشر نواز اور بمبئی سے آئے ہوئے ہندی کے معروف ادیب، شاعر اور دانش ور وجے کمار بھی اس سفر میں ہمارے ساتھ تھے۔ بشر کی موجودگی نے اس سفر کو میرے لیے بہت دل فریب بنا دیا تھا۔ انھیں اکیڈمی کی طرف سے اعزازیے کے طور پر کچھ رقم ملی تھی اور اس رقم کو وہ اپنی مہماں نوازی پر خرچ کر دینے کے لیے بے قرار تھے۔ پہلے انھوں نے مجھے اپنے ساتھ کوئی فلم دکھانے کی دعوت دی۔ پھر اس پر مصر ہوئے کہ میں اپنے ساتھ شریفوں کی ایک پیٹی دلّی لے جاؤں۔ پھر کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہرانے پر اصرار کیا۔ آخر میں انھوں نے میری بات رکھ لی اور دولت آباد، پھر ایلورا چلنے پر ہامی بھری۔ راستے میں خلد آباد کے ایک چائے خانے پر اچانک کسی اردو اخبار میں باقر مہدی کے انتقال کی چھوٹی سی خبر دکھائی دی اور ہم سب افسردہ ہو گئے۔ زندگی اچانک رونما ہونے والے واقعات کا ایک سلسلہ ہی تو ہے۔ بیٹھے بٹھائے وقت کو نہ جانے کیا ہو جاتا ہے!

بشر سے باقر مہدی کی اچھی خاصی دوستی تھی اور وہ جب بھی بمبئی جاتے تھے، باقر مہدی کے فلیٹ سے تین منزلیں نیچے، اسی عمارت "روبی ورشن" کے ہی ایک فلیٹ میں اکثر اختر الایمان کے ساتھ ٹھہرتے تھے۔ انھیں اپنے شہر کی اور صوبے کی سیاست میں بھی کچھ دخل رہا تھا۔ لیکن قاضی سلیم کی طرح، بشر بھی ایک ناکام، ستھرے سیاست داں تھے اور اس دنیاداری سے کوسوں دور، جو سیاسی زندگی گزارنے والوں کو دیکھتے دیکھتے کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے۔ فلمی دنیا سے تعلق بھی انھیں راس نہ آیا۔ کئی فلموں کے گیت لکھے اور اچھے گیت لکھے، مگر مقبول عام نہ ہو سکے۔ رائج الوقت اصولوں اور معیاروں کے مطابق انھیں جینا نہیں آتا تھا۔ ایسے ہی ملتے جلتے عنوان کی ایک نظم "تجھے جینا نہیں آتا" میں بشر نے کہا تھا:

کسی سے کچھ شکایت ہے نہ شکوہ
کہ میں تو درد کا موسم ہوں
اپنے آپ میں پلتا ہوں، اپنے آپ میں جیتا ہوں
اپنے آنسوؤں میں بھیگتا ہوں مسکراتا ہوں
مگر سب لوگ کہتے ہیں
تجھے جینا نہیں آتا—

اخباروں سے پتا چلا کہ اورنگ آباد کے اسی اجاڑ احاطے میں جہاں سراج اورنگ آبادی آسودۂ خاک ہیں، بشر نواز کو بھی دفن کر دیا گیا۔

---

144-B، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی-110025

❖❖❖

# رشید حسن خاں پر کی گئی تحقیق

ایک تحقیقی و تنقیدی جائزہ

**ابراہیم افسر**

ڈاکٹر گیان چند جین نے تحقیق کیا ہے؟ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''لغات میں تحقیق کے معنی کھوج، تفتیش، دریافت، چھان بین دیے ہیں۔ تحقیق کا عمل نئی نوع انسان کے بچپن سے تاحال نیز ایک فرد کے بچپن سے مرگ حیات جاری رہتا ہے۔''

مذکورہ بالا تعریف کے تناظر میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تحقیق ایک مشکل راہ ہے۔ یہ راستہ بالکل سہل نہیں ہے۔ از سر نو دریافت، تفتیش، تلاش کسی بھی محقق کے لیے آسان نہیں بلکہ اس کام کو آنکھوں سے تیل نکالنے کے مترادف قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

آج جس طریقے سے تحقیقی کاوشیں محققین کے ذریعے ہو رہی ہیں کیا ان سے مطمئن ہوا جا سکتا ہے؟ یہ سوال اردو قاری کے لیے لازمی ہے۔ اردو ادب میں جن محققین کا اسم گرامی بڑے ادب و احترام سے لیا جاتا ہے ان میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر گیان چند جین اور رشید حسن خاں سر فہرست ہیں۔ ان حضرات نے اپنی سخت محنت، کاوش اور جاں فشانی سے اردو تحقیق کو نئی سمت اور جہت عطا کی۔

اس دور میں اگر آج کوئی محقق نیا تحقیقی سفر شروع کرنا چاہتا ہے تو ان بزرگوں کے بتائے ہوئے تحقیقی اصول و ضوابط کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اگر ان بزرگوں کے کارناموں، کاوشوں اور تحریروں میں ترمیمات ہونے لگے اور پھر ان ترمیمات کو کتابی شکل میں منظر عام پر لایا جانے لگے تو ایسے ادبی کارناموں پر محققین کے ساتھ ساتھ عام قاری کا برہم ہونا لازمی ہے۔

مذکورہ بالا اردو محققین میں رشید حسن خاں کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ رشید حسن خاں کی شناخت اردو ادب میں محقق، نقاد، خدائے تدوین، متنی نقاد، ماہر لسانیات، تبصرہ نگار، اردو املا، زبان و قواعد کے عظیم سالار کے طور پر ہوتی ہے۔ تحقیق و تدوین میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کے ادبی کارنامے کتابی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ رشید حسن خاں کو اردو مقدمہ نگاری میں بھی فوقیت حاصل ہے۔ نیز ان کی ادبی کاوشوں سے طلبہ ہی نہیں بلکہ دانش گاہوں کے اساتذۂ کرام بھی خوب مستفیض ہوتے ہیں لیکن افسوس و حیرت تب ہوتی ہے جب اردو ادب کی قد آور شخصیات رشید حسن خاں کی تحریروں میں ترمیمات اور تحریفات کر کے اردو دنیا کے سامنے اسے نئی تحقیق کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ لیکن جب ان تحریروں کا موازنہ رشید حسن خاں کی اصل تحریروں سے کیا جاتا ہے تو سچائی روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ ان بڑی بڑی ادبی شخصیات نے کس طرح سے تحقیق کے اصول، ضوابط کے دامن کو چھوڑ کر سہل پسندی اختیار کی اور اردو کے عام قاری کی بات تو بہت بعد کی ہے نقادوں نے بھی اس جانب توجہ نہ دی۔

رشید حسن خاں کا تحقیق سے تعلق جنون کسی سے چھپا نہیں ہے۔ وہ لفظ بہ لفظ کسی بھی حوالے کو دیکھ کر ہی، پڑھ کر ہی اپنی تحریروں میں پیش کرتے تھے۔ اس لیے ان کی تحقیقی و تدوینی کاوشیں اس سے لے کر جن سالوں میں منظر عام پر آئیں۔ رشید حسن خاں نے کبھی بھی سہل پسندی اختیار نہیں کی۔ ان کی تحقیقی و تدوینی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ملک کی مختلف دانش گاہوں نے انھیں اپنے یہاں ادبی خطبے دینے کے لیے مدعو کیا۔ لیکن آج رشید حسن خاں پر تحقیق کرنے والے لوگوں نے ہی ان کے بتائے ہوئے اصول و ضوابط سے کنارہ کشی یا راہ فرار اختیار کر لی ہے۔

آئیے اب ان تحقیقی اغلاط کی جانب رخ کرتے ہیں، جو رشید حسن خاں پر تحقیق یا ترتیب کرتے ہوئے در آ گئی ہیں۔

تمام اہل علم کو معلوم ہے کہ رشید حسن خاں کی تاریخ ولادت کاغذی اسناد کے مطابق 10 جنوری 1930 ہے لیکن ڈاکٹر وسیم رضا نے رشید حسن خاں کی تاریخ ولادت کے بارے میں جو تحقیق کی ہے وہ چونکانے والی اور حیرت انگیز ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ڈاکٹر وسیم رضا کو مظفر پور یونیورسٹی (بہار) نے ''رشید حسن خاں ایک عبقری شخصیت'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''سال پیدائش سے متعلق اطہر فاروقی نے لکھا ہے کہ تعلیمی اسناد کے مطابق 25 جنوری 1930 ہے ('کتاب نما' کا خصوصی شمارہ، صفحہ 9)۔ یہی تاریخ ولادت ان کے مضمون 'رشید حسن خاں: سوانحی خاکہ' میں بھی درج ہے، جو خاں صاحب کے پس از مرگ 'اردو دنیا' اپریل 2006 میں شائع ہوا ہے۔''

ڈاکٹر وسیم رضا کے دعوے کی جب تحقیق 'کتاب نما' کے خصوصی شمارے (مرتب ڈاکٹر اطہر فاروقی) سے کی گئی تو اس میں رشید حسن خاں کی تاریخ ولادت 10 جنوری 1930 درج ہے نہ کہ 25 جنوری 1930۔ رشید حسن خاں کی ملازمت کے بارے میں بھی ڈاکٹر وسیم رضا اپنی کتاب میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''اسی اثنا میں انھیں اسلامی ہائر سیکنڈری اسکول میں اردو اور فارسی ٹیچر کی ملازمت مل گئی۔''

تحقیق بتاتی ہے کہ رشید حسن خاں نے اسلامی ہائر سیکنڈری اسکول میں اردو تو پڑھائی لیکن ان کی تقرری عربی اور فارسی مضامین پڑھانے کے لیے ہوئی تھی۔ اس بارے میں ڈاکٹر تسنیم اقتدار علی (لکھنؤ) کا یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''اسی زمانے میں اسلامی ہائر سیکنڈری اسکول، شاہجہاں پور میں فارسی عربی کے استاد کی جگہ خالی ہوئی اور ان کو وہاں ملازمت مل گئی۔''

رشید حسن خاں کے دونوں بیٹوں (خورشید حسن خاں اور خالد حسن خاں) کی ملازمت کے بارے میں بھی تمام طرح کی قیاس آرائیاں ہیں۔ راقم حروف کی تحقیق کے مطابق رشید حسن خاں کے بڑے بیٹے خورشید حسن خاں بیسک ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ، یوپی میں جونیر ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر اور دوسرے بیٹے خالد حسن خاں مدرسہ نور العلوم دلازاک (شاہجہاں پور) میں مدرسہ جدید کاری اسکیم کے تحت ریاضی کے استاد ہیں۔

دونوں بھائیوں کی ملازمت کے بارے میں ڈاکٹر عبدالمجید جنھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے 'رشید حسن خاں اور ادبی تحقیق' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے، نے لکھا ہے:

''رشید حسن خاں کے دونوں بیٹے بروقت اترپردیش گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم میں اردو کے استاد ہیں۔''

یہی بات ڈاکٹر لی آوریا (جموں و کشمیر) نے بھی اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''خاں صاحب کے دونوں بیٹے گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم میں اردو ٹیچر ہیں۔''

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور) نے 'مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی' مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد میں ایک کتاب کا نام ہی غلط تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہم کمرۂ ہال پہنچے۔ ایک چارپائی پر کتابیں بڑے سلیقے سے اس طرح چنی ہوئی تھیں کہ ان کے پشتے نظر آ رہے تھے۔ شاید کچھ کتابیں دو ایک الماریوں میں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے ایک کتاب 'مالک رام: ایک مطالعہ' از ایم شاہد کی تلاش تھی۔ خاں صاحب کے پاس ایک فاضل نسخہ موجود تھا، از راہ تلطف مجھے دے دیا۔''

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے جس کتاب کا حوالہ دیا ہے اس کا اصل نام 'اردو تحقیق اور مالک رام' از شاہد ماہلی، ایم اے' ہے۔ آگے چل کر رفیع الدین ہاشمی نے رشید حسن خاں کی تاریخ وفات کا حوالہ اس طرح دیا ہے:

''مشفق خواجہ کی وفات (21 فروری 2005) کے تقریباً ایک سال بعد (26 جنوری 2006) رشید حسن خاں کا سانحۂ ارتحال پیش آیا تھا۔''

رشید حسن خاں کا انتقال 26 جنوری 2006 کو نہیں بلکہ 26 فروری 2006 کو ہوا تھا۔ اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد (شاعر، محقق، نقاد اور ادیب ساتھ ہی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد کے شعبۂ اردو میں بطور لیکچرر) نے صفحہ اول پر جو تاریخ درج کی ہے وہ اس طرح ہے:

''اردو کے ممتاز محقق اور نقاد رشید حسن خاں (1925-2002) کے تریسٹھ غیر مطبوعہ خطوط (مع حواشی و تعلیقات)''

موصوف نے یوم وفات میں پورے چار سال کا فرق کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے کتاب کے آخر میں فلیپ پر رشید حسن خاں کا تعارف پیش کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''رشید حسن خاں (دسمبر 1925- 26 جنوری 2006)''۔

جب کہ اسی کتاب میں صفحہ 37 پر تاریخ وفات 26 فروری 2006 درج ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے رشید حسن خاں کے خطوط کے بارے میں لکھا:

''زیر نظر مجموعے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے نام رشید حسن خاں کے پچاس مکاتیب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بارہ غیر مطبوعہ مکاتیب بطور ضمیمہ شامل مجموعہ ہے۔ ان میں سے 9 خط عبدالوہاب خاں سلیم کے نام ہے، ایک خط ڈاکٹر تحسین فراقی،

ایک مشفق خواجہ اور ایک خط مدیر 'ترجمان القرآن' کے نام ہے۔ یوں اس مجموعے میں شامل مکاتیب کی مجموعی تعداد 62 ہے۔"[8]

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے رشید حسن خاں کے 63 غیر مطبوعہ خطوط کا ذکر صفحہ اول پر کیا ہے اور صفحہ 12 پر 62 خطوط کا تذکرہ ہے۔ اس طرح ایک خط کا حوالہ کم کر دیا گیا ہے۔

رشید حسن خاں کے دہلی سے شاہجہاں پور منتقل ہونے پر بھی محققین میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر عبدالحمید اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"آخر میں 2 فروری 1994 کو مستقل طور پر شاہجہاں پور منتقل ہو گئے۔"[9]

ڈاکٹر ارجمند آرا (دہلی یونیورسٹی) نے اس تعلق سے لکھا ہے:

"جب میں نے کاٹر ہال جانا شروع کیا، خاں صاحب اسی کے 9 نمبر کمرے میں رہتے تھے۔ بعد میں غالباً 1995 میں جب وہ اپنے آبائی وطن شاہجہاں پور چلے گئے تو ایک عرصے تک یہ سلسلہ رہا کہ وہ جب بھی دہلی آتے اسی کمرے میں ٹھہرتے رہے۔"[10]

جب کہ رشید حسن خاں نے ڈاکٹر شمس بدایونی کو 5 فروری 1996 کو اپنی وطن واپسی کے بارے میں لکھا:

"میں 2 فروری کو یہاں پہنچ گیا۔"[11]

لیکن ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا نے اپنی دوسری کتاب 'رشید حسن خاں: محقق اور مدون' میں یہ دعویٰ کیا کہ:

"جنوری 1996 کے آخر میں خاں صاحب شاہجہاں پور اپنے آبائی شہر منتقل ہو گئے۔"[12]

رشید حسن خاں کی تعلیمی استعداد کے بارے میں بھی ناقدین و محققین کی آرا الگ الگ ہیں۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے رشید حسن خاں کی تعلیمی لیاقت کے بارے میں لکھا ہے:

"دبیر کامل: لکھنؤ یونیورسٹی 1946–1948 (امتیاز)، مولوی: عربک پرشین بورڈ الہ آباد 1946–1948 (امتیاز)"۔[13]

ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا نے اپنی کتاب 'رشید حسن خاں کے خطوط' میں رشید حسن خاں کی دبیر کامل اور مولوی کی تعلیم کا ذکر تو کیا ہے لیکن سال درج نہیں کیا۔ رشید حسن خاں کی تعلیمی لیاقت کے بارے میں راقم الحروف کی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ رشید حسن خاں نے دبیر کامل (فارسی میں ڈپلومہ) لکھنؤ یونیورسٹی سے اول درجے کے ساتھ 1952 میں پاس کیا۔ دبیر کامل کی سند پر کنوینر (فارسی)، رجسٹرار اور وائس چانسلر کے دستخط (27 دسمبر 1952) ہیں۔ اسی طرح رشید حسن خاں ادیب کامل جامعہ اردو (علی گڑھ) سے اندراج نمبر 2008، رول نمبر 8، مدرسہ فیض عام شاہجہاں پور سے نومبر 1949 میں درجہ اول سے پاس کیا۔ انھیں سند 30 مارچ 1950 کو تفویض کی گئی۔

رشید حسن خاں کے لکھے ہوئے خطوط میں بھی تحقیق کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ ترمیمات و تحریفات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ان کے خطوط میں لفظ تک بدل دیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر ارجمند آرا نے 19 اپریل 1997 کو لکھے رشید حسن خاں کے ایک خط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

"اگر تمھیں چاہتی ہو تو کام میں لگ جاؤ۔"[14]

اسی خط کا حوالہ ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا نے اس طرح دیا ہے:

"اگر یہ نہیں چاہتی ہو تو پھر کام میں لگ جاؤ۔"[15]

ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا نے اپنے لفظ 'یہ' اور 'پھر' کا اضافہ کیا ہے۔ اسی ضمن میں جب ہم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے نام لکھے خطوط کا طائرانہ جائزہ لیتے ہیں (مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتبہ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد اور 'رشید حسن خاں کے خطوط' مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا) تو خطوط کی اندرونی سطور میں کئی جگہ الفاظ بدلے ہوئے ملتے ہیں۔ ایک ایسا ہی خط رشید حسن خاں نے رفیع الدین ہاشمی کے نام 20 مارچ 1984 کو تحریر کیا تھا جو پیش نظر ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے اپنی کتاب میں اسے یوں درج کیا ہے:

۱- واقعہ یہ ہے کہ 'حسین' اور 'حسین' میں بڑا معنوی فرق ہے۔

۲- اور تحقیق شرک کو قبول کرتی نہیں۔

۳- اور ہاں، یہ آپ 'ایڈیشن' کیوں لکھتے ہیں؟ اڈیشن لکھنا چاہیے۔ ٹ کے لیے 'ڈ' کافی ہے۔ اگر 'ٹ' ہوتا تب 'ای' لکھیے۔"[16]

اسی خط کو ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا نے اپنی کتاب میں اس طرح درج کیا ہے:

۱- واقعہ یہ ہے کہ 'حسین' اور 'حسین' میں مخصوص فرق ہے۔

۲- اور تحقیق ترک کو قبول کرتی نہیں۔

۳- اور ہاں، یہ آپ 'ایڈیشن' کیوں لکھتے ہیں؟ اڈیشن لکھنا چاہیے۔ ٹ کے لیے 'ڈ' کافی ہے۔ اگر 'ز' ہوتا تب 'ای' لکھیے۔"[17]

3 جولائی 1989 میں رفیع الدین ہاشمی کے نام لکھے خط کو ڈاکٹر ارشد محمود نے اپنی کتاب میں اس طرح درج کیا ہے:

۱- ایک صاحب اُدھر جا رہے ہیں، اپنی پریشان نگاریوں کا مجموعہ آپ کے لیے بھیج رہا ہوں۔

۲- یعنی یک کرشمہ دو کار۔[18]

ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا نے اسی خط کو اس طرح درج کیا ہے:

۱- ایک صاحب اُدھر جا رہے ہیں، اپنی پریشان نگاریوں کا مجموعہ آپ کے لیے بھیج رہا ہوں۔

۲- یعنی یک کرشمہ دو کار۔"[19]

ایک اور خط جو رشید حسن خاں نے 25 دسمبر 1990 کو رفیع الدین ہاشمی کے نام لکھا، اس خط کو ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے اپنی کتاب میں اس طرح درج کیا ہے:

"آپ نے کیسی گراں آرزو کتاب کا انتساب کیسے بیچ میرزا کے نام کیا ہے۔"[20]

ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا نے اپنی کتاب میں اس طرح درج کیا ہے:

"آپ نے کیسی گراں اور کتاب کا انتساب کیسے بیچ میرزا کے نام کیا ہے۔"[21]

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اور ٹی۔ آر۔ رینا دونوں نے ہی خطوط کے حوالے سے اپنے اپنے دلائل پیش کیے ہیں۔ ان دونوں حضرات کے خطوط میں الفاظ کی ترمیمات، تحریفات، حذف و اضافہ ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایسے میں قاری کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس کا خط اور متن صحیح ہے۔ اس مسئلے کا واحد حل رشید حسن خاں کے خطوط کے اصل متن سے دونوں کا ملان ہے۔

رشید حسن خاں کی تدوینی کاوشوں اور صلاحیتوں سے کون واقف نہیں ہے۔ رشید حسن خاں نے کلاسیکی ادب کی 7 کتابوں کو مرتب کیا اور ان پر عالمانہ و گراں بہا مقدمات بھی تحریر کیے۔ یہ مقدمے آج بھی ان کتابوں میں جوں کے توں درج ہیں۔ لیکن حیرت تب ہوتی ہے جب ان مقدمات کے صفحات کی تعداد میں اضافہ اور کمی قاری کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں میں دو کتابوں کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا۔

ڈاکٹر خالد مبشر نے اپنے تحقیقی مقالے (مقدماتی ادب تحقیق و تنقید، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض 2012، غیر مطبوعہ) میں رشید حسن خاں کے مقدموں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"۱- فسانۂ عجائب کا مقدمہ 114 صفحات پر مشتمل ہے۔"[22]

"۲- انتخاب ناسخ کا مقدمہ 124 صفحات کا ہے۔"[23]

"۳- گلزار نسیم کا مقدمہ ڈیڑھ سو صفحات کو محیط ہے۔"[24]

"۴- مثنویات شوق کا مقدمہ 168 صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔"[25]

"۵- (زٹل نامہ) اس کتاب کا مقدمہ 93 صفحات کا ہے۔"[26]

ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف اور ڈاکٹر جاوید رحمانی نے اپنی کتاب 'رشید حسن خاں: کچھ یادیں، کچھ جائزے' میں 'باغ و بہار' کے مقدمے کے صفحات 136 بتائے ہیں۔[27] 'مثنویات شوق' پر بھی رشید حسن خاں نے 168 صفحات کا مقدمہ لکھا۔[28] 'زٹل نامہ' کا مقدمہ 93 صفحات کا ہے۔"[29]

ان تینوں حضرات کے دعووں کے برعکس رشید حسن خاں کے مقدمات کے متعلق جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ 'فسانۂ عجائب' کا مقدمہ 114 صفحات کا نہیں ہے۔ 'فسانۂ عجائب' پر رشید حسن خاں نے صفحہ 15 سے لے کر صفحہ 114 تک گراں قدر مقدمہ تحریر کیا ہے یعنی مقدمہ کل 99 صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح 'باغ و بہار' کا مقدمہ صفحہ 13 سے لے کر 136 تک تحریر کیا گیا ہے یعنی 'باغ و بہار' کا مقدمہ 124 صفحات کا ہے نہ کہ 136 صفحات کا۔ 'انتخاب ناسخ' کا مقدمہ صفحہ 7 سے لے کر صفحہ 132 تک لکھا گیا ہے۔ مقدمے کی کل صفحات کی تعداد 126 ہے نہ کہ 124۔ 'گلزار نسیم' کا مقدمہ صفحہ 11 سے لے کر صفحہ 150 تک تحریر کیا گیا ہے یعنی اس مقدمے کی کل ضخامت 140 صفحات پر ہے نہ کہ 150 صفحات پر۔ 'سحرالبیان' کا مقدمہ صفحہ 11 سے لے کر 142 تک لکھا گیا ہے یعنی اس کتاب کا مقدمہ 132 صفحات پر مشتمل ہے۔ 'مثنویات شوق' کا مقدمہ صفحہ 11 سے لے کر 166 تک تحریر کیا گیا ہے۔ مقدمے کی کل ضخامت 155 صفحات ہے نہ کہ 168 صفحات پر۔

ان مقدمات کی ضخامت اور کل صفحات کی تعداد میں واضح فرق نمایاں ہے۔ دانش گاہوں اور اردو اداروں میں ہو رہی تحقیق طلبہ اور نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہوتی ہے۔ اگر ملک کی دانش گاہوں اور ادبی اداروں میں اسی طرح سے تحقیق ہوتی رہی جو سہل پسندی کا اعلا ترین نمونہ ہے اور محقق و نقاد بھی اس جانب غفلت برتتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب طلبہ اور نئی نسل اردو تحقیق سے ناواقف اور بے نیاز ہو جائیں گے۔ ایسی حالت میں اردو تحقیق کی سمت، رفتار اور جہت متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ آج تمام اہل اردو کو اس جانب اپنی توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کاوشوں سے اردو تحقیق سہل پسندی سے مبرا ہو کر اپنے اصل مقام و مرتبے کو حاصل کر لے گی۔

## حواشی:

۱۔ تحقیق کا فن، گیان چند جین، ص 17، قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2008۔

۲۔ رشید حسن خاں ایک عبقری شخصیت، ڈاکٹر وسیم رضا، صفحہ 15، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2013۔

۳۔ ایضاً، ص 55۔

۴۔ دھوپ چھاؤں چہرے، ڈاکٹر نسیم اختر، صفحہ 101، عالیہ اکادمی، نئی دہلی 2014۔

۵۔ رشید حسن خاں اور ادبی تحقیق، ڈاکٹر عبدالحمید، صفحہ 21، کتابی دنیا، نئی دہلی 2013۔

۶۔ 'رشید حسن خاں کے خطوط' مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا، صفحہ 23، اردو بک ریویو، نئی دہلی 2011۔

۷۔ 'مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی' مرتب: ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، صفحہ 19 ادبیات اردو بازار لاہور، جون 2009۔

۸۔ ایضاً، ص 21۔

۹۔ ایضاً، ص 1۔

۱۰۔ ایضاً، ص 12۔

۱۱۔ 'رشید حسن خاں اور ادبی تحقیق' ڈاکٹر عبدالحمید، صفحہ 21، کتابی دنیا، نئی دہلی 2013۔

۱۲۔ 'رشید حسن خاں: کچھ یادیں، کچھ جائزے' مرتبین: ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، صفحہ 121، کتب الحرا، دربھنگہ، بہار، 2008۔

۱۳۔ 'رشید حسن خاں کے خطوط' مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا، صفحہ 654، اردو بک ریویو، نئی دہلی 2011۔

۱۴۔ 'رشید حسن خاں: محقق و مدون' ڈاکٹر

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

# اردو دُنیا

## اترپردیش میں 3500 اردو اساتذہ کی تقرری کا فیصلہ

لکھنؤ (20 جولائی)۔ اترپردیش میں اردو ٹیچرز کے عہدے پر معلم اردو سند یافتگان کی بھرتی عدالتی چارہ جوئی میں پھنسنے کے بعد اس سلسلے میں پائی جانے والی ناراضگی کو دور کرنے کے لیے ریاستی حکومت نے ایک بار پھر پرائمری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی بھرتی کی راہ ہموار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے لیے بیسک شکشا پریشد کے اسکولوں میں اردو ٹیچرز کے 3500 نئے عہدے وضع کیے جائیں گے۔ چیف سکریٹری آلوک رنجن کی صدارت میں ہونے والی میٹنگ میں اس پر اتفاق ہوا۔ خیال رہے کہ 20 جولائی کو ہی معلم اردو سند یافتگان کے وفد نے وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو سے ملاقات کی تھی، جس میں وزیر اعلیٰ نے یقین دلایا کہ اردو ٹیچروں کی بھرتی کی جائے گی۔ اس یقین دہانی پر معلم اردو والوں نے 118 دنوں سے لکھنؤ میں جاری اپنا دھرنا ختم کرنے کا اعلان کیا۔ حکومت کی سطح پر پائی جانے والی سرد مہری کی وجہ سے دھرنے اور مظاہرے کی نوبت آگئی تھی۔ چیف سکریٹری کی صدارت میں ہونے والی میٹنگ کے بعد ابتدائی تعلیم کے محکمے کو اب اردو ٹیچروں کے عہدے وضع کرنا ہے اس کے بعد بھرتی شروع ہوگی۔
محکمہ کے ذرائع نے بتایا کہ سب کو تعلیم مہم کے تحت 2011-12 میں ریاست میں منظور ہوئے بیسک شکشا کے پرائمری اسکولوں میں ٹیچروں کے تقریباً 20 ہزار نئے عہدے وضع کیے جا رہے ہیں، ان میں سے 3500 عہدے اردو زبان کے ٹیچروں کے ہوں گے۔ اس سلسلے میں وزیر اعلیٰ کی سطح سے حکم ملنے کے بعد چیف سکریٹری نے متعلقہ افسران کی میٹنگ بلائی۔ یاد رہے کہ سماج وادی پارٹی کی موجودہ حکومت قائم ہونے کے بعد 17 اگست 2013 کو پرائمری اسکولوں میں اردو ٹیچروں کے 4280 عہدوں پر بھرتی کے لیے جی او جاری ہوا تھا۔ اس پر 11 اگست 1997 سے پہلے کے معلم اردو سند یافتگان اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈپلوما ان ٹیچنگ پاس امیدواروں کی تقرری کرنی تھی۔ تقریباً 3200 عہدوں پر تقرری ہوئی تھی کہ معاملہ ہائی کورٹ میں چلا گیا اور عدالت کے حکم پر بھرتی روک دی گئی۔ معاملہ لٹکنے پر معلم اردو سند یافتگان نے دھرنا مظاہرہ شروع کر دیا۔ اس درمیان ٹیچروں یا معلمین اردو کے مختلف وفود نے وزیر اعلیٰ سمیت دیگر ذمہ داروں اور افسروں سے ملاقات کی اور تقرری شروع کرنے کی درخواست کی۔ لیکن بات نہیں بنی۔ آخرکار 2017 کے اسمبلی انتخابات کی آمد آمد نے ریاستی حکومت کو مجبور کیا کہ وہ اس بارے میں فیصلہ کرکے خود کو مشکل سے بچائے۔
(انقلاب۔ دہلی)

## اردو کی حالت زار پر اظہار تشویش

باغپت، یوپی (22 جولائی)۔ صوبائی سرکار اردو کے نام پر کروڑوں روپے کا بجٹ اس کے فروغ کے لیے جاری کرتی ہے۔ اردو اکادمی کی جانب سے اردو جلسے، مشاعرے، جشن اور استقبالیے وغیرہ منعقد کیے جاتے ہیں، لیکن اردو کی بدحالی ذرا بھی دور نہیں ہو رہی ہے۔ اس صورت حال پر اردو حلقوں میں بڑی مایوسی ہے۔ سرکاری سطح پر کہیں اردو کا فروغ یا چلن نظر نہیں آتا۔ سرکاری دفتروں میں اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملے عرصہ ہو چکا ہے، لیکن آج تک کہیں بھی انتظامیہ میں اس کا کوئی رول نہیں ہے۔ سرکاری احکام اور سرکلر بھی جاری ہوتے رہتے ہیں، لیکن ان پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ آل انڈیا اردو تنظیم نے اس صورت حال پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ضلع میں ایک بھی اردو میڈیم سرکاری پرائمری اسکول نہیں ہے اور پرائمری سے لے کر انٹر کلاس تک کہیں بھی اردو تعلیم کا نظم نہیں ہے۔ اردو تنظیم نے مطالبہ کیا کہ سرکار پرائمری اسکولوں میں اردو کو بحیثیت ایک لازمی مضمون کے تعلیم کا بندوبست کرائے اور ہندی کے ساتھ اردو کو بھی روزگار سے جوڑتے ہوئے ضلع کے سرکاری دفتروں میں رائج کرائے۔ اردو تنظیم نے صوبائی اردو اکادمی کے ذمہ داروں، ادیبوں، شاعروں اور اردو کے سبھی حلقوں سے اپیل کی کہ وہ اردو کی پرائمری سطح پر تعلیم اور سرکاری دفاتر میں اردو رائج کرانے کے لیے آگے آئیں۔
(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

## ضلع پریشد اردو میڈیم اسکول میں اساتذہ کی تقرری کا مطالبہ

حیدرآباد (8 جولائی)۔ رکن اسمبلی جناب سید احمد پاشاہ قادری نے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر میدک کو ایک مکتوب روانہ کرتے ہوئے ضلع پریشد ہائی اسکول اردو میڈیم کنکولے منڈل ضلع میدک کے لیے انگلش و فزکس میں اسکول اسسٹنٹس، اساتذہ کی تقرری کے لیے نمائندگی کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس اسکول کے لیے اساتذہ کی دو اسامیاں مختص کی گئی ہیں لیکن ان دونوں اساتذہ کو اپر پرائمری اسکول کیا گھر منڈل جبراً عملاً منتقل کر دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ضلع پریشد ہائی اسکول اردو میڈیم کنکولے منڈل حتی پلی میں طلبہ کی تعداد 149 ہے۔ اطراف و اکناف کے 20 دیہاتوں سے بچے تعلیم کے لیے اس اسکول میں آتے ہیں، اس اسکول میں ان مضامین کے اساتذہ کی سخت ضرورت ہے۔ انھوں نے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر سے خواہش کی کہ وہ اسکول کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انگلش و فزکس میں اسکول اسسٹنٹس اساتذہ کی تقرری کو یقینی بنائیں۔
(اعتماد۔ حیدرآباد)

## اب تک نصابی کتابوں کی تقسیم نہیں

دھربارہ بہار (7 جولائی)۔ محکمہ تعلیم کے افسران کی لاپرواہی سے بلاک کے پرائمری اور مڈل اسکولوں میں اب تک درس و تدریس کی کتابیں تقسیم نہیں ہوئی ہیں جس سے یہاں کے بچوں کو پڑھنے لکھنے میں کافی دشواریاں ہو رہی ہیں۔ کچھ اسکولوں میں تھوڑی بہت کتابوں کی تقسیم کرکے افسران کے ذریعے صرف کورم پورا کرلیا گیا ہے۔ درجہ اول، دوم، چھٹا، ساتواں میں دو کتابیں ہندی اور انگریزی کی تقسیم کی گئی ہیں وہ بھی مناسب مقدار میں دستیاب نہیں کرائی گئی ہیں جس سے کئی بچے کتابیں لینے سے محروم رہ گئے۔ گرلز مڈل اسکول دھربارہ کی کئی طالبات نے بتایا کہ کتابوں کی کمی کے سبب ہماری پڑھائی نہیں ہو رہی ہے۔ وہیں کئی درجہ کے بچوں کو ایک بھی کتابیں نہیں دی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں بی ڈی او اروند پرکاش کا کہنا ہے کہ جلد ہی کتابیں بھی اسکولوں میں مہیا کرا دی جائیں گی۔
(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

## پوسٹ سینکشنڈ نہیں تو اردو اکادمی کے اساتذہ واپس بھیجے جائیں گے

### اردو اکادمی نے مکتوب بھیج کر وزیر اعلیٰ کو موجودہ صورت حال سے واقف کرایا

نئی دہلی (14 جولائی)۔ دہلی سرکار کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی برسوں سے جاری کمی کے باوجود ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ نے نئے اساتذہ کا تقرر آج تک نہیں کیا لیکن پہلے سے ہی مختلف اسکولوں میں اردو اکادمی دہلی کے تحت جز وقتی طور پر پڑھا رہے اردو اساتذہ کو باہر کی راہ دکھانے کی تیاری ضرور کرلی ہے۔ حال ہی میں ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ نے یہ حکم صادر کیا ہے کہ جن اسکولوں میں اردو اساتذہ کی پوسٹ سینکشنڈ نہیں ہے وہاں اردو اکادمی کے اساتذہ بھی نہیں پڑھائیں گے اور انھیں اکادمی واپس بھیج دیا جائے۔ اس حکم نامے کے بعد اردو اکادمی کے تحت پڑھانے والے اساتذہ میں تشویش پیدا ہوگئی ہے۔ گزشتہ دنوں وزیر اعلیٰ اروند کیجریوال نے اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کی میٹنگ میں اردو اساتذہ کی تقرری کے مطالبے کے بعد وزیر تعلیم اور ایجوکیشن ڈائرکٹر کے ساتھ میٹنگ کی تھی جس میں دیگر افسران اور اردو سے متعلق اہم شخصیات بھی شامل تھیں۔ اس میٹنگ میں ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ سے سرکاری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی کمی کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے کو کہا گیا تھا۔ ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ نے ابھی تک وزیر اعلیٰ کو یہ رپورٹ تو پیش نہیں کی ہے البتہ یہ حکم ضرور جاری کر دیا ہے کہ اگر اسکولوں میں اردو کی پوسٹ سینکشنڈ ہوگی تو اردو اکادمی کے اساتذہ کام کریں گے ورنہ انھیں واپس بھیج دیا جائے گا۔ اس کی وجہ سے اردو اکادمی کے ماتحت پڑھانے والے اساتذہ میں کافی ناراضگی اور بے چینی ہے۔ ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کے اس رویے سے اردو والا طبقہ کافی حیران ہے اور اس کی مذمت بھی کی جا رہی ہے۔ کچھ اساتذہ کے ذریعے اردو اکادمی میں رابطہ قائم کیے جانے کے بعد اردو اکادمی نے وزیر اعلیٰ اروند کیجریوال جو اکادمی کے چیئرمین بھی ہیں، انھیں مکتوب بھیج کر اس صورت حال سے واقف کرایا ہے۔ اکادمی کے ذرائع کے مطابق ڈائرکٹوریٹ نے ہدایت دی ہے کہ اگر گیسٹ ٹیچر آجاتا ہے تو اکادمی کے ٹیچر کو ہٹا دیا جائے گا۔ اکادمی کے مطابق ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ نے خود 2012 میں جاری اپنے سرکلر میں کہا تھا کہ اردو اکادمی کے کسی بھی ٹیچر کو نہیں ہٹایا جائے گا۔ اس سلسلے میں اکادمی وائس چیئرمین فاؤنڈیشن کے چیئرمین فرید احمد نے کہا کہ وزیر اعلیٰ نے محکمہ تعلیم سے اساتذہ کے متعلق جو رپورٹ مانگی تھی وہ تو اس نے پیش نہیں کی اور یہ نیا حکم جاری کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک پوسٹ سینکشنڈ ہونے کی بات ہے تو اسکولوں کے پرنسپل لکھ کر اپنی جانب سے ریکوائرمنٹ بھیجتے ہی نہیں ہیں تو پھر پوسٹ سینکشنڈ کیسے ہوگی؟ اردو اکادمی کے اساتذہ برسوں سے ایسے ہی کام کر رہے ہیں اور اب انھیں واپس بھیجنے کی بات کی جا رہی ہے جو محکمہ تعلیم کی ناانصافی ہے۔ محکمہ اردو اساتذہ کے تعلق سے وزیر اعلیٰ کو مسلسل گمراہ کرتا آرہا ہے اور اب بھی اس کا کہنا ہے کہ صرف 67 پوسٹ سینکشنڈ ہیں جن میں سے صرف 18 اسامیاں ہی خالی ہیں جنھیں پُر کر دیا جائے گا۔ فرید احمد کا کہنا ہے کہ ضابطے کے مطابق اگر کسی اسکول کی کلاس میں 10 بچے بھی اردو پڑھنا چاہیں تو انھیں ایک ٹیچر مہیا کرانا لازمی ہے۔ دہلی سرکار کے 900 اسکول ایسے ہیں جن میں ہر اسکول میں 20-25 سے 100-150 تک طلبہ اردو پڑھنا چاہتے ہیں اس طرح کم سے کم 700 اردو اساتذہ کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اردو میڈیم اسکول الگ ہیں جہاں دیگر سبجیکٹ کے اردو ٹیچرز کی زبردست کمی ہے جن کے بارے میں محکمہ تعلیم کوئی بات ہی کرنے کو تیار نہیں ہے اور گزشتہ سالوں میں یہ کہہ کر معاملے کو دبانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ سائنس، ریاضی، جغرافیہ اور سوشل سائنس وغیرہ کے اردو ٹیچرز ملتے ہی نہیں ہیں جب کہ یہ بات سراسر بے بنیاد ہے۔
(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

## اتر پردیش کے تمام اضلاع میں انٹرمیڈیٹ کالج کے قیام کا فیصلہ

علی گڑھ (29 جون)۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے بانی سرسید احمد خاں کو دو صد سالہ یوم پیدائش پر شاندار خراج عقیدت پیش کرنے کے مقصد سے اتر پردیش کے سبھی اضلاع میں انٹرمیڈیٹ کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سرسید احمد خاں کی پیدائش 17 اکتوبر 1817 کو دہلی میں ہوئی تھی۔

سرسید کی 200 سالہ تقریبات کو منعقد کرنے کے سلسلے میں وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ) کی صدارت میں ایک انتظامی کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے۔ جنرل شاہ نے 129 سال قبل آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ اس ضمن میں ایک معاہدہ کیا ہے تاکہ کالجوں کے قیام کے خواب کو تعبیر سے ہمکنار کیا جاسکے۔ مذکورہ تنظیم کا قیام مسلمانوں میں جدید اور سائنسی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے 1886 میں سرسید کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ اس تنظیم نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی تشہیر اور مغربی تعلیم کے تئیں مسلمانوں کے شکوک و شبہات کو رفع کرنے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ایک دور میں یہ مسلمانوں کی سب سے مضبوط تنظیم تصور کی جاتی تھی۔ جنرل شاہ نے بتایا کہ انٹرمیڈیٹ کالجوں کے قیام کے سلسلے کا پہلا ادارہ اتر پردیش کے مظفر نگر کے جولا گاؤں میں قائم کیا گیا ہے جس میں اگست 2015 سے تعلیم و تدریس کا عمل شروع ہوجائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس ادارے میں اساتذہ کی تقرری کا عمل شروع کیا جاچکا ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ یہ بھی ادارے سی بی ایس ای سے تسلیم شدہ ہوں گے اور سکولر بنیادوں پر قائم ان اداروں میں سبھی مذاہب کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا۔ انھوں نے واضح کیا کہ مسلمانوں کے لیے کسی قدر ریزرویشن کا نظم کیا جائے گا۔ جنرل شاہ نے کہا کہ یہ ادارے عیسائی مشنری اسکولوں کی طرز پر چلائے جائیں گے تاکہ اسکولی نظام کی بہتری کے ذریعے طلبہ کو ابتدا سے ہی مضبوط بنایا جاسکے تاکہ وہ اس قابل ہوں کہ اعلا تعلیم کے اداروں مثلاً آئی آئی ٹیز، آئی آئی ایمس اور این ای اے وغیرہ میں بڑے پیمانے پر داخلہ حاصل کرسکیں۔ انھوں نے کہا کہ اپنے کیریر اور دوستوں کے درمیان میں نے دیکھا ہے کہ جن مسلمان بچوں کو اچھی اسکولی تعلیم دستیاب ہوئی انھوں نے آگے چل کر اعلا تعلیمی اداروں میں آسانی سے داخلہ حاصل کرلیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کی سب سے اہم ضرورت ایسے اسکولوں کا قیام ہے۔ انھوں نے کہا کہ یوپی کے تمام اضلاع میں زمین کی فراہمی کے لیے مخیر حضرات سے رجوع کیا جائے گا اور ساتھ ہی دنیا بھر میں پھیلے فرزندان علی گڑھ سے بھی مالی تعاون حاصل کیا جائے گا۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

## معلّمین اردو کے وفد کی وزیر اعلا سے ملاقات

## یقین دھانی کے بعد دھرنا ختم

لکھنؤ (20 جولائی)۔ بی ای ٹی پاس معلّمین اردو ایسوسی ایشن کے وفد نے وزیر اعلا کی دعوت پر ان کی رہائش گاہ 5، کالی داس مارگ پر تنظیم کے ریاستی صدر ارشاد رہانی کی قیادت میں اکھلیش یادو سے ملاقات کی۔ وزیر اعلا نے معلّمین کے مطالبات کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے 4280 ٹیچروں کی تقرری کو مکمل کرانے اور نئی سیٹوں کی منظوری کا یقین دلاتے ہوئے بھرتی عمل جلد شروع کرانے کا بھروسہ دلایا۔ وزیر اعلا کے ہمراہ کابینی وزیر راجیندر چودھری اور وزیر صحت احمد حسن بھی موقعے پر موجود تھے۔ وزیر اعلا کی مذکورہ یقین دہانی کے بعد ریاستی صدر ارشاد رہانی نے 116 دن سے جاری دھرنے کے اختتام کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے تحریک کا جن لوگوں نے ساتھ دیا ان سبھی کا شکریہ ادا کیا۔ وزیر اعلا کی اس یقین دہانی کی معلّمین اردو اور محبان اردو نے ستائش کی ہے۔ اس موقعے پر ارشاد رہانی کے علاوہ محمد وسیم ندوی، ایم اے خان، فاطمہ حنیف، ریتو لوجھی اور سلمٰی بانو، ام صفیہ فریدی، محمد جاوید اختر، غیاث الدین اور شہاب الدین وغیرہ خاص طور سے شریک رہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

## تعلیمی سال کے آغاز ہونے کے بعد بھی اردو اساتذہ کی تقرری کا عمل مکمل نہیں

نئی دہلی (22 جولائی)۔ دہلی کے سرکاری اسکولوں میں جتنی کمی اردو اساتذہ کی ہے اتنی ہی لاپرواہی اردو اساتذہ کی تقرری میں کی جاتی رہی ہے۔ نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوچکا ہے اور ابھی اردو اساتذہ کی کاؤنسلنگ بھی پوری نہیں ہو پائی بلکہ آج سے کاؤنسلنگ شروع ہورہی ہے جو 29 جولائی تک جاری رہے گی۔ اس کاؤنسلنگ میں فی الحال 64 امیدواروں کے نام ہیں جن میں سے صرف دو لوگوں کو ہی اسکول الاٹ کیے گئے ہیں باقی کو سلیکشن کے بعد اسکول دیے جائیں گے۔ اس کے پیچھے وجہ بتائی جارہی ہے کہ کچھ اسکولوں کے پرنسپل نے ڈی ڈی ای کو امیدواروں کی لسٹ نہیں بھیجی ہے جس کی وجہ سے انھیں اسکول الاٹ نہیں کیے گئے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ جنوبی دہلی ضلع میں ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن (ڈی ڈی ای) نے ٹی جی ٹی اردو کی کاؤنسلنگ کرنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کردیا کہ یہاں اب سیٹیں خالی نہیں اور اسکولوں میں نوٹس بھی چسپاں کردیا گیا ہے۔

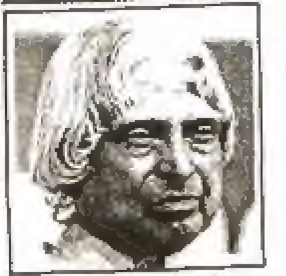
غور طلب ہے کہ روزنامہ 'انقلاب' نے چوتھی لسٹ نہ جاری کرنے کے تعلق سے خبر شائع کی تھی جس کے بعد ہی اے ای کے فیصلے پر تاریخ پلاننگ برانچ نے چوتھی لسٹ جاری کردی ہے۔ اس لسٹ میں کل 64 امیدواروں کے نام ہیں جن میں سے دو کو اسکول الاٹ کردیا گیا باقی 62 امیدواروں کو سرٹیفکٹ کی جانچ ڈی ڈی ای سے کرانے کے بعد اسکول الاٹ کیا جائے گا۔

حیران کن بات یہ ہے کہ جنوبی ضلع میں ڈی ڈی ای نے اردو اساتذہ کی کاؤنسلنگ کرنے سے انکار کردیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں سبھی مطلوبہ پوسٹ پُر ہوچکی ہیں اس لیے مزید امیدواروں کی ضرورت نہیں ہے جب کہ گزشتہ سالوں میں طلبہ کی تعداد کو دیکھتے ہوئے بعد میں اساتذہ کی تقرری کی جاتی رہی ہے۔ امیدواروں سے کہا جارہا ہے کہ یہاں کوئی سیٹ خالی نہیں ہے جب کہ لسٹ میں 7 امیدواروں کے نام شامل ہیں۔

اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے جدوجہد کرنے والے سماجی کارکن منظر علی خاں نے اس پورے معاملے پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ پلاننگ برانچ کو چاہیے کہ جس طرح دو لوگوں کو اسکول الاٹ کیے گئے ہیں ایسے ہی نئی لسٹ جاری کرکے امیدواروں کے نام کے آگے ضلع نہ دے کر اسکول کا نام دے تاکہ امیدواروں کی تقرری آسان ہوسکے۔ انھوں نے وزیر اعلا سے بھی مطالبہ کیا کہ دہلی حکومت کے جن اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے پڑھ رہے ہیں وہاں تیسری زبان کے طور پر اردو پڑھائی جائے اور منظور شدہ پوسٹ بھی طے کی جائے۔

(انقلاب۔ دہلی)

## رفتید ولے نہ از دل ما



شیلانگ۔ 'میزائل مین' کے طور پر مقبول رہے سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کا 27 جولائی 2015 کی شام آئی آئی ایم شیلانگ میں ایک لیکچر دینے کے دوران حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کی خبر سے ملک بھر میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ مرکزی حکومت نے ان کے اعزاز میں 7 دن کے قومی سوگ کا اعلان کیا ہے۔ ڈاکٹر کلام کو شام قریب 6.30 بجے لیکچر کے دوران گرنے کے بعد نازک حالت میں بیتھنی اسپتال کے ICU میں داخل کرایا گیا اور اس کے دو گھنٹے سے زیادہ وقت کے بعد ان کے انتقال کی تصدیق کی گئی۔ شام کو قریب 5 بج کر 40 منٹ پر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ پہنچنے کے بعد ڈاکٹر کلام نے کچھ وقت آرام کیا اور اس کے بعد شام 6 بج کر 35 منٹ پر اپنا لیکچر شروع کیا۔ آئی آئی ایم شیلانگ کے ڈائرکٹر پروفیسر ڈے نے بتایا کہ اس کے 5 منٹ بعد ہی ڈاکٹر کلام گر پڑے۔ انھوں نے آخری ٹوئٹ کیا تھا: "زندگی جینے کے قابل سیارے پر آئی آئی ایم میں کلاس لینے کے لیے شیلانگ جارہا ہوں"۔ شام 7 بجے انھیں ادارے سے تقریباً ایک کلو میٹر دور بیتھنی اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ ڈے نے بتایا کہ اسپتال انتظامیہ نے انھیں بتایا کہ ڈاکٹر کلام کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر کلام اکتوبر میں 84 سال کے ہونے والے تھے۔

ڈاکٹر عبدالکلام 25 جولائی 2002 کو ہندوستان کے گیارھویں صدر کے طور پر منتخب ہوئے اور 25 جولائی 2007 تک اس عہدے پر رہے۔ انھوں نے ملک کو ایک ترقی یافتہ اور عظیم طاقتور ملک بنانے کا خواب دیکھا اور اپنی کی تخلیقات میں اس تصور کو پیش کیا۔ ملک کے 11ویں صدر ڈاکٹر عبدالکلام کی پیدائش 15 اکتوبر 1931 کو تامل ناڈو کے رامیشورم قصبے کے ایک متوسط خاندان میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم 5 سال کی عمر میں رامیشورم کے پرائمری اسکول سے شروع ہوئی۔ وہ بچپن سے ہی خاصے باصلاحیت رہے۔ 'میزائل مین' کے نام سے مشہور ڈاکٹر کلام کا بچپن جدوجہد سے پُر رہا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد رامناتھ پورم کے شوارٹز ہائی اسکول میں داخلہ لیا، وہاں کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے 1950 میں سینٹ جوزف کالج، ترچراپلی میں داخلہ لیا، وہاں سے انھوں نے طبعیات اور ریاضی موضوعات کے ساتھ بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ اپنے اساتذہ کے مشورے پر انھوں نے پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لیے مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، چنئی کا رخ کیا۔ وہاں پر انھوں نے اپنے خوابوں کو شکل دینے کے لیے ایروناٹیکل انجینئرنگ کا شعبہ منتخب کیا۔

ڈاکٹر عبدالکلام کے انتقال پر صدر جمہوریہ ہند پرنب مکھرجی، نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری، وزیر اعظم نریندر مودی، وزیر داخلہ راج ناتھ سنگھ، کانگریس صدر سونیا گاندھی اور مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے افسوس کا اظہار کیا ہے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

لکھنؤ۔ مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر جتیندر پردیپ کا 20 جولائی 2015 کی صبح 5 بجے حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 90 برس تھی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کملا دھون، ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہیں۔ ڈاکٹر جتیندر پردیپ اپنے بڑے بیٹے کے انتقال سے بہت مغموم تھے۔ ضعیفی کا عالم تھا لیکن اس کے باوجود ان کا قلم جاری و ساری تھا۔ درجنوں علمی و ادبی تصانیف ان کی یادگار ہیں۔

ڈاکٹر جتیندر پردیپ کی آخری رسوم بھینسا کنڈ میں ادا کی گئی، جس میں ادیبوں اور شاعروں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ ڈاکٹر جتیندر پردیپ نے ہمیشہ خود کو تمام جھمیلوں سے پاک رکھتے ہوئے سنجیدگی سے لکھتے رہنے ہی کو مفید سمجھا۔ کبھی کسی خاص گروپ، کسی تنظیم یا کسی مخصوص شخصیت سے خود کو وابستہ نہیں کیا۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ (ادارہ)

# نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : ریحان خرد
مصنف : ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
ضخامت : 208 صفحات
قیمت : 119 روپے
ملنے کا پتا : ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ
مومن پورہ، ناگپور، 440018
تبصرہ نگار : ابو صارم صارم
sarimabusarim@gmail.com

ریحان خرد ڈاکٹر شرف الدین ساحل کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی اشتراک سے شائع ہوا ہے جس میں 24 مضامین شامل ہیں۔ مجموعے کا انتساب مصنف نے اپنے نور چشم محمد ربیع الدین کے نام کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں بہ عنوان 'شناس نامہ' مصنف کا تعارف اور اس کے بعد ایک مضمون 'محرک' ریحان خرد' ساحل صاحب نے پیش کیا ہے، وہ لکھتے ہیں

"ناگپور میری جنم اور کرم بھومی ہے۔ یہ میرا وطن عزیز ہے۔ اس کے ہر ذرے سے مجھ کو گہری محبت ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ 1970 سے اب تک اس کی تاریخ کے پوشیدہ اور منتشر مواد کو بے انتہا تلاش و تحقیق کے بعد حاصل کر کے میں کئی کتابیں اور مضامین تحریر کر چکا ہوں جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب 'ریحان خرد' میں شامل تنقیدی مضامین بھی اسی جذبہ محبت کے زیر اثر معرض وجود میں آئے ہیں"۔

کتاب کا پہلا مضمون 'مولانا اکبر کی نعتیہ شاعری' ہے جس میں ساحل صاحب نے مولانا اکبر کی شاعری پر پر مغز گفتگو کی ہے اور ان کی نعتوں سے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ وہیں ناطق گلاوٹھوی کی غزلوں پر کچھ یوں روشنی ڈالی ہے: "ان کی غزلوں میں کہیں بھی شوقیانہ انداز نہیں ہے بلکہ تصور عشق پاکیزہ ہے اور جو بات کہی گئی ہے عشق کے آداب کو مد نظر رکھ کر کہی گئی ہے"۔

مید ناگپوری کا غم، طرف قریشی کا طرز شاعری، سوز خیرآبادی کی جدت پسندی اور شاطر حکیمی کا فکری رس اس کتاب کے اچھے اور معلوماتی مضامین ہیں۔ شاطر حکیمی کی نظموں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ساحل صاحب نے کئی جگہ کی باتیں کی ہیں اور ان کی طویل نظم 'میرا' کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ نظم ایک طوائف کی زندگی اور اس کی کلفت کے عیش، نشاط کی دردناک عکاسی کرتی ہے۔

مانی ناگپوری: آزادانہ تخلیقی عمل کا شاعر، نیر انصاری کا ذاتی کرب، آصف الہ آبادی: احساسات کا شاعر اور شارق جمال کا عکس برعکس، یہ بھی مضامین قابل قدر ہیں۔

مضمون 'جلیل ساز کا فکری سفر' میں مصنف نے جلیل ساز کے فکری سفر کا منزل بہ منزل تجزیہ پیش کیا ہے وہیں شاہد کبیر کو بے تقید اور شاعر تسلیم کیا ہے تو پروفیسر یونس کی کتاب 'انکشاف' پر مصنف کچھ یوں رقم طراز ہوتے ہیں "اس کتاب میں موجود ایک حمد، ایک نعت، ایک مناجات اور 120 غزلوں کے 875 شعروں میں ان کی تقریباً 48 سال کی فکر، مطالعے، مشاہدے اور تجربے کار ہیں"۔

مکیش ناگپوری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں اداسی، بے چینی اور خود شکستگی کا کرب ہے تو فرید تنویر کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ان کے یہاں جذبات و احساسات کا کھرا پن اور گہری معصومیت ہے۔ یونس انیس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں کہیں بھی تہذیب و شرافت دم توڑتی نظر نہیں آتی۔ ظفر کلیم کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ وہ ابہام سے دور رہ کر انتہائی سادگی لیکن پرکاری سے اپنے فن کی تخلیق کرتے ہیں۔

مضمون 'شریف کی ذہنی جرأت' میں شریف احمد شریف کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ عام گفتگو میں نرم اور ادبی گفتگو میں گرم تھے۔ وہیں 'مدحت الاختر کا منفرد آہنگ' میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے دلی جذبات کی ترسیل سادگی سے کی ہے اور عصری حسیت کا اظہار والہانہ انداز سے کیا ہے۔

نشتر کا نوکیلا لب و لہجہ، منظور اثر کا نقش خیال، کلیب قوثی کا حسیاتی اسلوب بھی اس مجموعے کے اہم مضامین میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر سید ربیع الدین کی افسانہ نگاری اور وکیل نجیب کی ناول نگاری کے بارے میں بھی ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے طویل اور پر مغز گفتگو کی ہے۔

●●●

نام کتاب : حرف تمنا (شعری مجموعہ)
مصنف : جمیل احمد جائسی
ضخامت : 80 صفحات
قیمت : 200 روپے
ناشر : فرینڈز گرافکس، 6/167
سرائے جولینا، مندر لین
نئی دہلی 110025
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

جمیل احمد جائسی کا پہلا شعری مجموعہ 'حرف تمنا' حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ ان سے میری ملاقات اڑتالیس سال پہلے لال بہادر شاستری نیشنل اکیڈمی برائے ایڈمنسٹریشن، مسوری میں بطور انڈین ریونیو سروس پروبیشنر ہوئی تھی جہاں میں نے اکادمی کے رسالے 'چیتنا' کا اردو سیکشن پہلی بار شائع کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے جمیل احمد جائسی نے 'چیتنا' کے لیے دو نظمیں عنایت کی تھیں جو اس مجموعے میں بھی شامل ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں دو مضامین 'کچھ اپنے متعلق' اور 'وطن عزیز جائس' کے علاوہ ۳ حمد و نعت، ۲ مدح کعبہ و مدینہ، ۳۳ نظمیں، ۸۰ غزلیں اور ۲۳ قطعات و رباعیات شامل ہیں۔ مجموعہ ۱۹۶۸ء سے لے کر گزشتہ سال تک کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ حصہ نظم باقی اصناف پر بھاری پڑتا ہے اور مطالعے سے صاف پتا چلتا ہے کہ شاعر پر علامہ اقبال کا کافی اثر ہے حالانکہ نظم 'کاوری' میں جوش ملیح آبادی کی گھن گرج بھی شامل رہتی ہے۔

اودھ کے ایک چھوٹے سے قصبے جائس میں ۱۹۵۰ء کے آس پاس ایک معمولی اور غیر تعلیم یافتہ دہقان کے گھر میں پیدا ہوئے جمیل احمد جائسی نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے مرحلے طے کیے۔ اسکول میں یوم ولادت ۳ جولائی ۱۹۵۰ء درج کیا گیا۔ ابتدا میں دو سال گھر میں تعلیم حاصل کر کے جائس میں پرائمری اسکول میں داخلہ لیا جہاں سے آٹھویں جماعت پاس کر لی۔ پھر رائے بریلی سے انٹر پاس کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میکینکل انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ اس کے بعد پہلے ۱۹۷۰ء میں انڈین انجینئرنگ سروس میں کامیابی حاصل کر لی اور پھر ۱۹۷۱ء میں انڈین سول سروس پاس کر کے انکم ٹیکس سروس میں تقرری ہوئی۔ اس ڈپارٹمنٹ سے ۲۰۱۰ء میں بطور چیف کمشنر آف انکم ٹیکس، چنڈی گڑھ سبکدوش ہوئے۔ جائس چھوٹا سا قصبہ سہی مگر مردم خیز علاقہ رہا ہے جہاں نامور شاعر ملک محمد جائسی کے علاوہ شاعروں اور دانشوروں کا ایک کارواں گزر چکا ہے۔ خود جمیل احمد نے زمانہ طالب علمی ہی میں افسانے اور مضامین تحریر کر کے اپنی ادبی زندگی کی شروعات کی اور پھر شاعری کے ہو کر رہ گئے۔ علی گڑھ میں نہ صرف ان کے چند مضامین شائع ہوئے بلکہ انھوں نے ایک پندرہ روزہ اخبار کی ادارت بھی سنبھال لی۔ انھی دنوں شعر کہنے کا شوق بھی چرایا اور جمیل تخلص کرنے لگے۔ مجموعے میں شامل مضمون 'وطن عزیز جائس' میں مصنف نے جائس کی تاریخ و جغرافیہ، مسلمانوں کی آمد، تہذیب و تمدن، دانشوران جائس، دوست و احباب، اساتذہ کرام اور اپنی زندگی کے اہم مرحلہ جات جیسے پیدائش، تعلیم اور پیشے کا بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے۔

'حرف تمنا' پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو یہ صاف عیاں ہوتا ہے کہ زیادہ تر نظمیں قدرتی مناظر، اہم دریاؤں، تاریخی مقامات اور مشہور ہستیوں پر رقم کی گئی ہیں۔ جمیل احمد جائسی فطرت کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں آمد کی فراوانی ہے اور کہیں کہیں مقصدیت بھی جھلکتی ہے۔ ان کا ذہن کبھی گنگا، کبھی جمنا اور کبھی کاویری سے سیراب ہوتا ہے۔ ان کا دل کبھی کشمیر اور کبھی مسوری کے قدرتی مناظر سے باغ باغ ہوتا ہے۔ ان کی آنکھیں کبھی دہلی کو دیکھ کر اس کی شان و شوکت کا تصور کرتی ہیں اور کبھی مانڈو کا نظارہ دیکھ کر اس کی عظمت رفتہ کو یاد کرتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہے ترا ازل سے بہ رگ جاں کشور ہندوستاں
اس چمن کی ساری شادابی تری ہی دین ہے
(گنگا)

برف کی دستار باندھے صف بہ صف پربت یہاں
کرتے ہیں حمد و ثنا اللہ کی قدرت ہے یہ
(کشمیر)

وہ تری پر پیچ راہوں سے گزرنا بار بار
جن پہ ہوتا تھا ہمیشہ زلف لیلیٰ کا گماں
(مسوری)

اٹھایا سر تو ستاروں نے بھی سلام کیا
گرا تو میر کا اجڑا دیار کہلایا
(دہلی)

جمیل احمد جائسی نے جہاں ایک طرف نامور شعرا جیسے امیر خسرو اور شاعر مشرق اقبال پر نظمیں کہی ہیں وہیں انھوں نے مذہبی رہنماؤں جیسے سوامی وویکانند پر بھی نظمیں رقم کی ہیں۔ ٹیپو سلطان کی حب الوطنی کو انھوں نے بڑی ہنرمندی سے اپنی نظم 'کاویری' میں بیان کیا ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر انیس و دبیر کے مرثیے یاد آتے ہیں:

بحر تھا علم و ادب کا فکر و فن کا شاہکار
سینہ اقبال میں ہر شے کا گہرا راز تھا
(علامہ اقبال)

وہ دویکانند وہ فکر و عمل کا بادشاہ
کرم ہوا اس کا اگر تحریریں بھی نایاب ہیں
(سوامی وویکانند)

وارث حیدر علی تھا وہ تو سالار تھا
جنگ میں ٹیپو تھا وہ اور امن کا سردار تھا
(کاویری)

جمیل احمد کی شاعری میں ان کا سماجی اور سیاسی شعور جھلکتا ہے۔ وہ دنیا میں ہو رہی تباہی پر نالاں ہیں اور فطرت کو بگاڑنے کی کوششوں سے انھیں کوفت ہوتی ہے۔ وہ ایک جانب گوریّا کے معدوم ہونے پر آنسو بہاتے ہیں تو دوسری جانب دریا کے درد کی تجسیم کرتے ہیں۔ اسی درد کی بازگشت کئی اور نظموں مثلاً 'جمنا'، 'وقت'، 'نئے شہر اور ترقی' میں بھی ملتی ہے۔

ندی سے نالا ہوئی اب یہی کا کہنا ہے
یہ نالا کیا ہوا؟ میرا ابھی نام جمنا ہے
(جمنا)

ہوئی ترقی انسانوں کی
دام بچھائے گوریا نے
(گوریا)

آج پھر بجا رہی ہیں تاج یاب
ہے صداقت پھر زبوں واشگاف یار
(اندھیرے)

کیسے ہیں یہاں کتنی ماؤں کے بچے
گھر سب ہیں کیسے یہ کدھر کا گھر ہے
(نئی تہذیب)

بہر حال ایک چیز جو ان کی شاعری کو انفرادیت بخشتی ہے وہ ہے شاعر کی رجائیت۔ وہ ہر سو تاریک مناظر کے باوجود امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔ انھیں اس دیش کی 'عدالت' پر بھروسہ ہے کہ یہاں "صداقت رہے گی، عدالت رہے گی۔" وہ اس نورانی 'لمحے' کے منتظر ہیں جس لمحے میں پیغمبر پیدا ہوتے ہیں اور دنیا میں نور پھیلاتے ہیں یا پھر جس لمحے میں صوفی اور ولی جنم لیتے ہیں اور دنیا میں اخوت اور صداقت کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

زمانہ منتظر ہے پھر انھیں لمحوں کا نسبے ہم
ہوئے جن کی عظمت سیکڑوں صدیوں پہ بھاری ہے

جمیل احمد ایک ایسے 'انقلاب' کے متمنی ہیں جس کے بعد سارے عالم میں انسانیت کا بول بالا ہو، نہ کہیں کوئی فساد ہو نہ خون ریزی ہو اور نہ ہی نفرتوں کی کھیتی ہو۔ نظم 'انقلاب' انھوں نے ۱۹۶۸ء میں الہ آباد کے دنگوں سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ فرماتے ہیں:

جمیل چھیڑ دو فکر کہ انقلاب آئے
یہ سارے طور زمانے کے یوں بدل جائیں

دراصل جمیل احمد کے تخلیقی شعور میں انسان کی حقیقت کو سمجھنے اور انسانیت کو زندگی کا شعار بنانے کی جستجو صاف نظر آتی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ نقل کر رہا ہوں:

زمانہ حسن و جوانی پہ ناز کرتا ہے
ہوئی جو شام یہی چہروں پہ شباب نہ تھا

عمر بھر کی ہائے تو یہ کمائی وطن
بس فقط دو گز زمیں و اک کفن

سب یہاں آباد ہوں، شاداب ہوں
پیار کے کچھ گیت گائے جائیے

کھو گئیں ہیں منزلیں گم ہو گئے ہیں کارواں
دشت پر باقی ہیں کچھ دھندلے سے قدموں کے نشاں
وقت کی آندھی انہیں بھی لے اڑے گی ایک دن
وقت کے آگے ہیں بے بس کون و مکاں

لا کر عزیز قربت کا لہجہ بے بس ہیں ہم
کہتے ہو کہ بھی زمانہ اس ناحق کو کچھ نہیں ہے غم
شرافت چھوڑ دی ہم نے عداوت بن گئی ادھم

اللہ ہاتھ میں بجز گئی ہیں ذہنوں میں فتنہ ہم

مجموعی طور پر مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ جمیل احمد چاکسی کے یہاں پختہ اور حساس ذہن ہے جو عبادت گزار بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ وہ اپنے دیگر اور ماحول پر سوال بھی اٹھاتے ہیں اور اس ماحول کو سنوارنے کے لیے نئی نسل کو پیغام بھی دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جمیل احمد ابھی ایک تصنیف پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ آگے بھی ان کا یہ تخلیقی سلسلہ جاری رہے گا۔ OO

## بقیہ: رشید حسن خاں پر کی گئی تحقیق

(صفحہ ۳ سے آگے)

ٹی آر رینا، صفحہ 30، اردو بک ریویو، نئی دہلی، فروری 2015۔
15. مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، صفحہ 33، ادبیات اردو بازار لاہور، جون 2009۔
16. رشید حسن خاں: کچھ یادیں، کچھ جائزے، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، صفحہ 124، مکتبہ الفرا، دربھنگہ، بہار، 2008۔
17. رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی آر رینا، صفحہ 151، اردو بک ریویو، نئی دہلی 2011۔
18. مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، صفحہ 47،48، ادبیات اردو بازار لاہور، جون 2009۔
19. رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی آر رینا، صفحہ 412-13، اردو بک ریویو نئی دہلی 2011۔
20. مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، صفحہ 99، ادبیات اردو بازار لاہور، جون 2009۔
21. رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی آر رینا، صفحہ 415، اردو بک ریویو، نئی دہلی 2011۔
22. مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، صفحہ 114، ادبیات اردو بازار لاہور، جون 2009۔
23. رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی آر رینا، صفحہ 437، اردو بک ریویو نئی دہلی 2011۔
24. معاصر اردو ادب، تحقیق و تنقید (غیر مطبوعہ) ڈاکٹر خالد مبشر، صفحہ 325، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، 2012۔
25. ایضاً، ص 328۔
26. ایضاً، ص 331۔
27. ایضاً، ص 334۔
28. ایضاً، ص 328۔
29. رشید حسن خاں: کچھ یادیں، کچھ جائزے، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، صفحہ 20، مکتبہ الفرا، دربھنگہ، بہار، 2008۔
30. ایضاً، ص 22۔
31. ایضاً، ص 31۔

وارڈ نمبر 1، مہاچند نرائن نگر پنچایت
سیوال خاص، ضلع میرٹھ 250501 (یوپی)
ibraheem.alwal@gmail.com

OOO

## بقیہ: عزیز وارثی: شخص اور شاعر

(صفحہ ۸ سے آگے)

ساگر قلم ایوارڈ سے نوازا گیا۔

عزیز وارثی نے اپنی زندگی کا آخری مشاعرہ یکم جولائی 1989 کو پڑھا جو انجمن تعمیر اردو کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ اس انجمن کے وہ 43 سال جنرل سکریٹری رہے۔ لیکن 28 دن بعد یعنی 20 جولائی 1989 کو عزیز وارثی نے اس جہان فانی کو خیرباد کہا۔

عزیز وارثی کے کلام کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کے مختلف مذاہب کی مقدس کتب کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ صرف مطالعہ ہی نہیں بلکہ ان کا اثر بھی قبول کیا جن کا فلسفہ ان کے بعض اشعار میں در آیا ہے۔

گیتا اور قرآن کا فلسفہ ہے کہ دنیا میں ہر بشر اکیلا ہے۔ یہاں کوئی کسی کا رشتہ دار نہیں، کوئی کسی کا دوست یا ساتھی نہیں۔ یہ دنیا جو آپ کو بہت حسین و بھلی لگتی ہے اصل میں یہ ایک ویرانے سے کم نہیں۔ اسی فلسفے کو عزیز وارثی نے کس خوب صورتی سے درج ذیل شعر میں سمویا ہے:

جب بھی غور کیا ہم نے زمانے پر عزیز
سچ تو یہ ہے کہ گلستاں بھی بیاباں نکلا

اس یونیورس یا کائنات کی ہزاروں نہیں لاکھوں کہکشاں ایک ہی نور الٰہی سے منور ہیں اور اسی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اس فلسفے کو عزیز وارثی نے کس خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے:

میں ہی تلاش دوست میں بھٹکا نہیں، مدام
گردش میں صبح و شام ہیں مہتاب و آفتاب

عزیز وارثی کے کلام میں فلسفیانہ اشعار کی کمی نہیں۔ روحانیت کی معراج کا نقشہ انھوں نے ان دو اشعار میں پیش کیا ہے:

تاب نظارہ کی چشم شوق لا سکتی نہیں
اس لیے اٹھتے نہیں پردے حریم ناز کے
جن کو ہم شام و سحر شام و سحر کہتے گئے
وہ اٹھتے سے کرتے ہیں نگاہ ناز کے

خدائی پیغام کو ظاہری الفاظ کا جامہ پہنا کر شعر کی صورت میں پیش کرنے کا انداز عزیز وارثی کا اپنا ہی ہے۔ ذیل کا شعر پڑھیے اور لطف اٹھائیے:

ساقی بزم ازل کہتا ہے ہم سے اے عزیز
آج تو دو گھونٹ پی کر پارسا ہو جائیے

خدا کی عبادت کیسے ہوتی ہے یہ کوئی عزیز وارثی سے سیکھے:

صنم خانے میں ان کا سجدے میں شب گزری
نشہ ہے بے خودی ہے کیے تو بھی تو کیا کیے

عزیز وارثی اصل میں غزل کے شاعر تھے۔ ان کے غزلیہ اشعار میں ایک درد و کرب چھپا ہوا ہے جو ان کے دل کے نہاں خانوں میں کروٹیں بدلتا رہتا تھا اور موقع و محل کے مطابق اُبل پڑتا تھا۔ غزل کی زبان و بیان پر انھیں مکمل دسترس حاصل تھی جس سے ان کے حسن بیان میں کمی نہیں آنے پاتی تھی۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکیت کا جوہر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں بعض دوسرے شعرا کا رنگ بھی جھلکتا ہے مگر اس سے ان کے کلام کے حسن میں اضافہ ہوا ہے، کمی واقع نہیں ہوئی۔ ان کا غزلیہ کلام 155 غزلوں اور 994 اشعار پر مشتمل ہے۔ ان تمام اشعار میں یہ قدیم روش پر عمل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عزیز وارثی نے اپنی زندگی میں ترقی پسند تحریک کا آغاز اور عروج و زوال دیکھا۔ جدیدیت و مابعد جدیدیت کا دور بھی دیکھا مگر انھوں نے اپنی روش کو نہیں بدلا اور نہ ہی کسی قسم کا لیبل اپنے اوپر چسپاں ہونے دیا۔ ان کے اشعار ان کے قلم کی نوک سے آتش سیال بن کر نکلے۔ ملاحظہ فرمائیں یہ شعر:

تم اگر دیکھنے والے کو نظر آ جاتے
حشر سے پہلے ہی اک حشر بپا ہو جاتا

ان کی وسیع القلبی دیکھیے:

حرم تک ہی اگر محدود ہوتی عاشقی اپنی
تمہی سوچو کہ پھر تم سامنے آتے کہاں

اس قسم کے حسین احتجاج کو پیش کرنے کی عموماً شعرا حضرات جرأت نہیں کرتے۔ دنیا میں تمام مذاہب کا انجام ایک ہے۔ ہم نے خدا اور اس کی عبادت کے طریقوں کو مختلف نام دے کر خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جب ایک انسان دوسرے انسان سے والہانہ عشق کرتا ہے تو وہ صنم پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس حقیقت سے اس کرۂ ارض کا کون ذی ہوش انکار کر سکتا ہے۔ عزیز وارثی کا یہ شعر دیکھیے:

خوشی کے لمحے بھی کچھ غم کے افسانے میں، کھو دیا
بالفاظ دیگر کہیے کہ صنم خانے میں رکھ دیا

بعض حضرات اس شعر کو حقیقت میں بغاوت سے تعبیر کر سکتے ہیں، مگر ان کے کلام میں ایسے اشعار اکثر آپ کی نظروں سے گزریں گے۔ یہاں کعبہ خوشی اور بت خانہ غم کی علامت بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عزیز وارثی کے کلام کے اچھے اشعار ان کے باطنی درد و کرب کے آتش کدے میں تپ کر منظر عام پر آئے ہیں۔ عزیز وارثی نے غم کو اپنا دوست بنا لیا تھا، ایسا دوست جو کسی حال میں ان کا ساتھ چھوڑنے والا نہیں تھا، مثلاً:

غم عشق، غم دوراں، غم ہستی کی قسم
اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

یوں تو ہماری اردو شاعری میں درد و غم سے متعلق ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ میر تقی میر کو تو غم کا شاعر ہی کہا گیا ہے۔ ان کے بہت سے ایسے اشعار کا انتخاب بھی شائع کیا گیا ہے۔ مگر زندگی میں درد و غم کو متاع لازوال بنا لینا عزیز وارثی ہی کے حصے میں آیا ہے، ملاحظہ فرمائیے اس شعر کو:

درد حیات درد دل درد فراق درد غم
یہ ہیں متاع لازوال ان سے عزیز پیار کر

اسی نوعیت کا یہ شعر دیکھیے:

سوز و گداز، رنج و الم، درد و اضطراب
مجھ سے جو بچ رہے ہیں تری قسمت کے ہیں

یوں تو غم کا کینوس محدود نہیں ہے۔ اس دنیاوی زندگی میں ہر انسان کو کسی نہ کسی طرح کے غم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض انسان ان غموں کا سامنا کرتے ہوئے ہار جاتے ہیں لیکن بعض انھی کے سہارے ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ عزیز وارثی کے غم کے اس فلسفیانہ شعر کا لطف اٹھائیے:

دو جہاں میرے پاس ہوتے ہیں
تیرا غم جب قریب ہوتا ہے

مذکورہ بالا سطور کی روشنی میں درج ذیل شعر ملاحظہ فرمائیں:

اپنوں کا غم زمانے کا غم اپنا غم عزیز
کیا کیا بلائیں آج ہے انساں لیے ہوئے

عزیز وارثی کے غم کے حصار سے نکل کر ہم ان کی زندگی کے کسی اور پہلو میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مے، میکدہ اور ساقی فارسی شاعری کی معرفت اردو شاعری میں در آئے۔ اردو شعرا کی تاریخ میں کوئی ایسا شاعر نہیں ہوگا جس نے ان الفاظ کو اپنے کلام میں استعمال نہیں کیا ہوگا۔ امیر خسرو سے لے کر دور حاضر کے شعرا نے ان الفاظ کو مختلف انداز میں برتا ہے۔ کلام غالب اور "خطوط غالب" ان کی زندہ مثالیں ہیں۔ اقبال، سرسید اور حالی بھی ان الفاظ کو برتے بغیر نہیں رہ سکے۔

(باقی آئندہ)

E-237، لوئر ہری سنگھ نگر، ریہاڑی کالونی
جموں 180005 (جے اینڈ کے)

پہلی قسط

# عزیز وارثی
## شخص اور شاعر

ٹی آر رینا

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے نصف اول یعنی 17 جولائی 1924 کو اتر پردیش کے ضلع مرادآباد کے قصبہ کچھرایوں کے چودھری نذیر احمد خاں، جو کہ ایک معمولی سے کسان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور محکمہ جنگلات میں بہ طور کلرک ملازم تھے، کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا، جس کا نام عزیز احمد رکھا گیا۔ بعد میں یہی بچہ بڑا ہو کر کلاسکی ادبی شاعری کے افق پر ایک درخشاں ستارے کے مانند چمکا۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز مقامی اسکول سے ہوا بعد میں جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کا امتحان پاس کیا۔

کم عمری میں حضرت حاجی اوگھٹ شاہ وارثی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا اور ان کے مرید ہوگئے۔ مرشد کی خواہش کے مطابق جوان ہونے پر انھیں 'انجمن اتحاد وارثیہ' اور 'خانقاہ وارثیہ کچھرایوں' کا جانشین مقرر کیا گیا اور یہ آخری وقت تک خانقاہ وارثیہ سے منسلک رہے۔

پیر و مرشد حاجی اوگھٹ شاہ وارثی انھیں 'ہمارا عزیز' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ بہ قول شاہ وارثی: "ان کے استاد جناب نوح ناروی نے ایک دن دوران گفتگو فرمایا میں نے آپ کے عزیز کو 'عزیز القدر' کا خطاب دیا ہے۔ میں نے کہا کیا آپ نے اچھا کیا، یہ واقعی 'عزیز القدر' ہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ سلسلہ وارثیہ کے حلقہ بگوش انھیں اسی خطاب سے مخاطب کریں"۔

مرشد اور استاد کی دعاؤں کے اثر نے ان کے اندر کے انسان کو جگایا اور اتنی توانائی بخشی کہ یہ ترقی کے منازل طے کرتے چلے گئے۔

ہندو میتھالوجی میں انسانی زندگی میں سب سے اول مقام اللہ تعالیٰ کا ہے جس نے پوری کائنات کو بنایا ہے، دوسرا مقام والدہ کا ہے جو بچے کو جنم دیتی ہے، تیسرا مقام گرو یا پیر و مرشد کا ہے جو انسان کو اندھیرے سے نکال روشنی کی طرف لے جاتا ہے یعنی اس کی روح کو روحانی اور دنیاوی تعلیم سے منور کرتا ہے۔ حضرت حاجی اوگھٹ شاہ وارثی کی دعاؤں نے عزیز احمد کو وارثیہ سلسلے کا وارث بنا دیا۔

کم عمری میں انھوں نے ایک چار بیت رقم کی جسے وارثیہ مجالس میں آنے والے قوال گانے لگے۔ اس حوصلہ افزائی نے ان کے اندر کے شخص اور شاعر کو جلا بخشی۔ تعلیمی اور شاعری کی منزلیں یہ ساتھ ساتھ طے کرتے چلے گئے۔

بچپن میں ہی ان کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ 12 برس کی عمر میں (1935-36) تلاش معاش کے سلسلے میں دلی آ گئے، یہاں ان کے بڑے بھائی علی منیر احمد قیام پذیر تھے۔ انھوں نے ان کو والدین کے سایے سے محروم ہونے کی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔

دلی کی ادبی سرگرمیوں نے ان کے شاعرانہ ذوق کو اور ہوا دی۔ 1942 میں ابوالمعظم نواب سراج الدین سائل دہلوی کے شاگرد ہوگئے۔ 1944 میں انھوں نے انھیں باضابطہ فن حضرت نوح ناروی کے سپرد کر دیا۔ 1947 میں تقسیم ملک نے دلی کی ادبی سرگرمیوں کو معطل کر کے رکھ دیا تھا، اس تعطل کے ختم ہونے کے بعد ادبی سرگرمیوں کا یہ سلسلہ 'بزم سخن' کے تحت دلی میں کالے صاحب کے احاطے میں شروع ہوا جس میں کنور مہندر سنگھ بیدی، حاجی حافظ رحمت الٰہی، جناب گلزار دہلوی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی اور میر مشتاق احمد خاص طور سے شرکت کیا کرتے تھے۔

عزیز احمد وارثی کی قابلیت و صلاحیت کو دیکھ کر انھیں انجمن تعمیر اردو کا جنرل سکریٹری اور انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ دلی کا جوائنٹ سکریٹری منتخب کیا گیا۔ انھوں نے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیے جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ ان عہدوں پر فائز ہونے کے بعد انھیں ملک کے اندر ہونے والے مشاعروں، ادبی محفلوں، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں مدعو کیا جانے لگا۔

دنیا میں ہر شخص دوہری زندگی جیتا ہے ایک باطنی، ایک ظاہری۔ باطنی درد و غم ہوتے ہوئے بھی بعض اشخاص کے لبوں پر ہمیشہ ایک ہلکا سا تبسم نظر آتا ہے جسے دیکھنے والے اس کے درد و کرب کا اندازہ نہیں کر پاتے۔ یہی حال عزیز وارثی کا تھا۔ باطنی تلخی میں جب کر جو اشعار ان کی زبان سے نکلے وہ سیدھے قاری کے دل و دماغ میں اترتے چلے گئے۔ غزل کے ایک دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

جس وارثیہ سلسلے سے ان کا تعلق اول تا آخر رہا وہاں تصوف کا ہونا لازم تھا۔ خانقاہیں اور تکیے کبھی تصوف سے خالی نظر نہیں آتے۔ تصوف ایک ایسی حد ہے جہاں صوفی تپ کر کندن بن جاتا ہے۔ اگر تصوف کا رنگ کسی شاعر پر چڑھ جائے اور اُسے زبان و بیان پر قابو ہو تو اس کی شاعری سننے والوں کو اس رنگ میں ہی نہیں رنگ دیتی بلکہ انھیں حیرت میں بھی ڈال دیتی ہے، مثلاً:

سنا ہے تم نے کلیم کو طور پر دکھایا تھا جو حیرت
وہی تماشا ہی منظر میں دکھا دو تو ہم بھی جانیں

بادہ نوش کا نشہ ہو کس لیے جام ہے ساقی
تجھی سے تو مری تشنگی بجھی نہیں جاتی

نقد دل و ہوش کچھ بھی نہیں رہا پاس
آپ کی جلوہ گاہ میں اور کریں نثار کیا

عزیز وارثی کے کلام کے چاروں مجموعے ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئے۔ 'سفینہ و ساحل' پہلی بار 1951 میں اور دوسری بار 1965 میں۔ اس کا ایک دیوناگری ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ 'محراب' اور 'جسارت' دونوں 1976 میں منظر عام پر آئے۔ 'تعرف' 1986 میں شائع ہوا۔ عزیز وارثی نے وارثیہ سلسلے کے تین اہم شعرا (حاجی اوگھٹ شاہ وارثی، بیدم شاہ وارثی اور بابا رضا شاہ وارثی) کے کلام کا انتخاب 1967 میں شائع کیا۔

صحافت میں بھی انھوں نے کافی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے اخبار 'ندائے اتحاد' 1955 میں جاری کیا جو 1982 تک مسلسل چھپتا رہا۔ شاعری کے افق پر ان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے دلی والوں نے 'جشن عزیز وارثی' کے نام سے تین جشن دلی میں بالترتیب 22 اگست 1976، 7 مئی 1986 اور 22 جنوری 1989 کو منعقد کیے۔

عزیز وارثی کی ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے ملک کے ادبی اداروں نے انھیں مختلف اوقات میں مختلف انعامات سے نوازا۔ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام 'محراب' کو اتر پردیش اردو اکیڈمی نے 1977 میں انعام سے نوازا۔ اسٹیٹ بینک ایسوسی ایشن دہلی نے انھیں 1985 میں 'دیش رکھشک' 'قومی ایکتا ایوارڈ' عطا کیا۔ ان کا چوتھا شعری مجموعہ 'تعرف' 1986 میں منظر عام پر آیا تو اسی سال دلی اردو اکیڈمی نے اس پر انھیں انعام عطا کیا۔ اس کے اگلے سال یعنی 1987 میں انھیں فرسٹ

(بقیہ صفحہ 7 پر)




مدیر: اطہر فاروقی — Editor: Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں — Joint Editor: Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر: عبدالباری — Printer, Publisher: Abdul Bari
مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
Printed at: Samar Offset Printing Press, Delhi
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایوینیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
Proprietor: ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue, New Delhi-110002
قیمت (فی شمارہ): تین روپے، سالانہ: ۱۲۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Subscription: (Per Issue): Rs. 3/-, Yearly: 125/- (Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org Phones: 23237212, 23237214